محاضرات شریعت
ڈاکٹر محمود احمد غازی
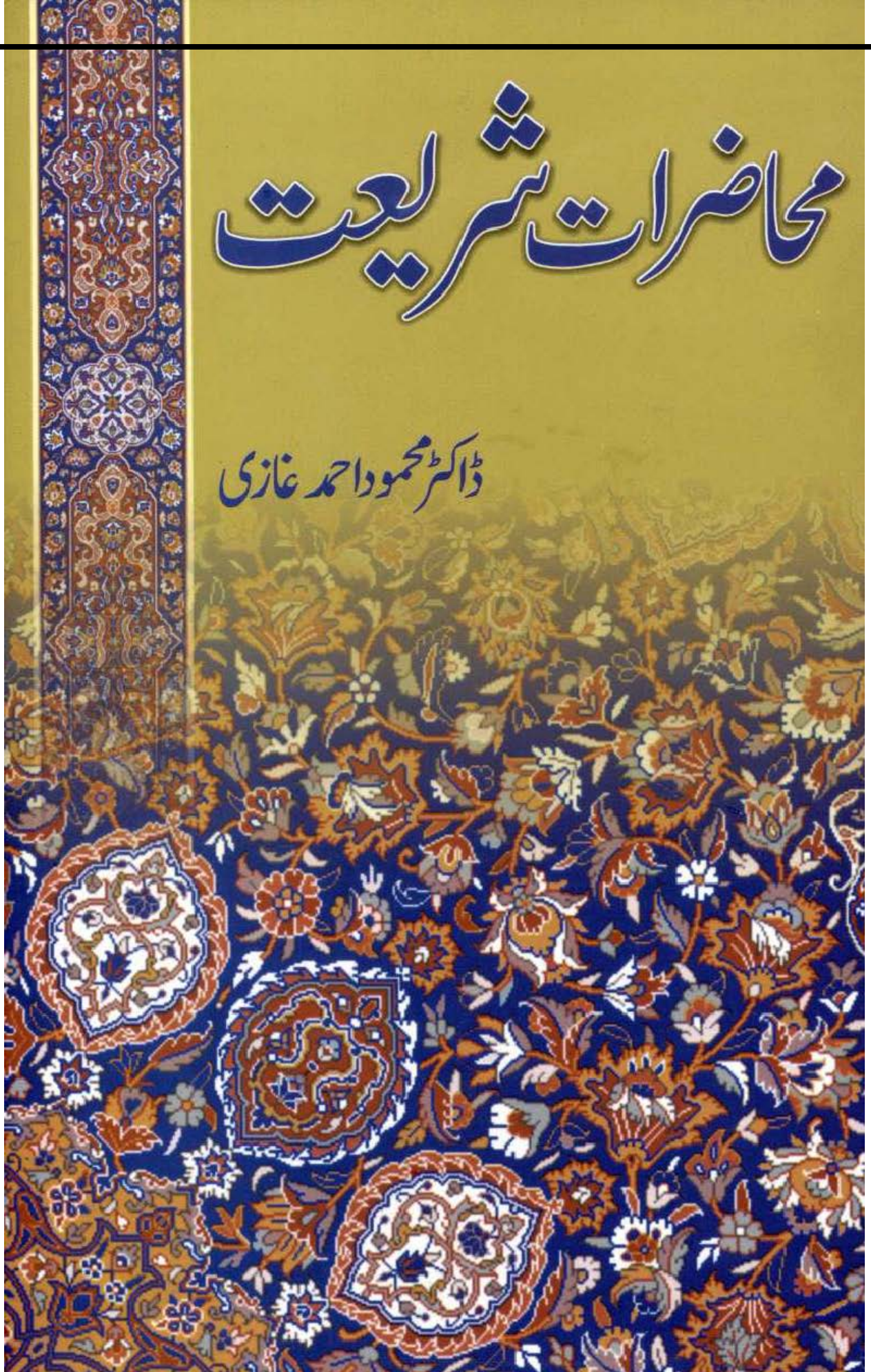
فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "وما ذا اعددت لها "؟تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے؟

اسی طرح سے بعض ایسے حقائق کے بارے میں قرآن پاک میں سوال نقل کیا گیا ہے جن کے مفصل اور واضح جوابات دیے جا سکتے تھے۔ لیکن اس وقت تک انسان کا علم اور مشاہدہ اس درجے تک نہیں پہنچا تھا کہ قرآن پاک کے بہت سے اولین مخاطبین اس سے فائدہ اٹھا سکتے۔ مثال کے طور پر پوچھا گیا "یسئلونک عن الأهلة" یہ چاند کا طلوع وغروب، اس کا کم وبیش ہونا یہ سب کیا ہے؟ اس کے جواب میں قرآن پاک نے کسی فنی یا سائنسی تفسیر کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ وہ جواب دیا جس سے چودہ سو سال پہلے کا ایک عام عرب بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا، آج کا انسان بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور آئندہ آنے والا انسان بھی ہر دور میں اس سوال کو اپنے لیے معنویت کا حامل پائے گا "قل هي مواقيت للناس والحج" کہہ دیجیے کہ یہ چاند کا نشیب وفراز اور اس کا کم وبیش ہونا یہ لوگوں کے لیے اوقات کے تعین میں مدد ومعاون ہوتا ہے اور حج کے اوقات اور تاریخوں کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ گویا یہ بتایا گیا کہ عبادات کے اوقات کا تعین چاند کے مہینوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے عبادات کے معاملے میں چاند کی انتہائی اہمیت ہے۔ رؤیت ہلال اور ظہور قمر یہ ساری چیزیں نہ صرف اوقات کے تعین میں بلکہ کئی اسلامی عبادات کے تعین میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام اور علمائے اصول نے واضح طور پر لکھا ہے کہ غیر ضروری عقلی مباحث کو اٹھانا، خاص طور پر دینی معاملات میں، یہ شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ امام شاطبی نے لکھا ہے: "التعمق مخالف لهدى الرسول والسلف الصالح "یعنی عام لوگوں کے روبرو حقائق شریعت کی گہرائیاں بیان کرنا غیر مفید ہے، اس لیے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت تو سب کے لیے ہے۔ شریعت جہاں غزالی اور رازی جیسے اعلیٰ ترین دماغوں کے لیے ہے وہاں ایک عام انسان کے لیے بھی ہے۔ وہ چودہ سو سال پہلے کے ایک بادیہ نشین عرب کے لیے بھی تھی اور آج کے متمدن انسان کے لیے بھی ہے۔ اس لیے اگر شریعت میں یہ سوالات اٹھائے گئے ہوتے تو یہ ماضی میں بہت سے لوگوں کے لیے الجھن کا سبب بنتے اور آج بھی اکثریت

کے لیے الجھن اور غلط فہمی ہی کا سبب ہوتے۔

تعمق اور عمیق سوالات عامۃ الناس کے مزاج اور ضروریات کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام نے اور خاص طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت نے ان سوالات کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔

اس گفتگو سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلام کے مزاج میں فلسفیانہ غور وخوض کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے، قرآن پاک میں، شریعت میں، بعض ایسے اشارات موجود ہیں جن سے کام لے کر مفکرین اسلام نے کلام، فلسفہ اور حکمت کے دفتر تیار کیے۔ لیکن یہ ایک محدود طبقے کے لیے تھا۔ ان دفاتر کی ضرورت نہ اچھا مسلمان بننے کے لیے ہے، نہ کسی شخص کو اخلاقی بلندیاں حاصل کرنے کے لیے ان تعمقات کی ضرورت ہے، نہ کسی شخص کو روحانی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے ان گہرائیوں میں جانے کی ضرورت ہے۔ ان گہرائیوں کی حیثیت دسترخوان علم کی چٹنی کی ہے۔ اگر کسی کو دلچسپی ہے تو اس چٹنی سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اگر کوئی شخص دسترخوان کے تمام کھانوں کو نظر انداز کر دے اور صرف چٹنی پر اکتفا کرنے لگے تو وہ اپنی صحت کا دشمن ہوگا۔

اس لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ انسانی زندگی کے مختلف مدارج، مراحل اور دلچسپیاں کیا ہیں اور ان کے بارے میں شریعت کا رویہ کیا ہے۔ چونکہ یہاں تعمق اور فکر کی بات آ گئی اس لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ علم کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے اور شریعت کا تصور علم کے لازمی اور واجب ہونے کے بارے میں کیا ہے۔

یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ حصول علم شریعت میں فرض ہے ''طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة ''۔ اس ایک حدیث پاک کے علاوہ بے شمار قرآنی آیات اور احادیث ایسی ہیں جن میں علم کی اہمیت کو بار بار بتایا گیا ہے۔ ان آیات واحادیث سے ہر مسلمان واقف ہے جن کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت میں علم کی حیثیت کیا ہے۔

شریعت کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک علم دوسرے عدل۔ شریعت کا بنیادی مقصد۔ جیسا کہ قرآن پاک کی ایک آیت میں واضح طور پر آیا ہے۔ حقیقی عدل وانصاف کا قیام ہے۔

''ولقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ''اور بلاشک وشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیاں دے کر اسی لیے بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب الٰہی اور میزان اسی لیے اتاری کہ لوگ حقیقی عدل وانصاف پر قائم ہو جائیں۔ گویا قرآن پاک کی رُو سے یہ تمام آسمانی کتابوں کا مقصد اولین اور ہدف اساسی رہا ہے کہ انسانی معاشرے میں حقیقی عدل وانصاف قائم ہو جائے، مکمل عدل وانصاف قائم ہو جائے۔ مکمل عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ معاشرے میں علم اور شعور کی سطح موجود ہو۔ اگر علوم اور شعور کی سطح معاشرے میں مطلوبہ درجے کی نہ ہو تو پھر اس معاشرے میں مکمل عدل وانصاف قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔

قرآن پاک کی رُو سے انسان خلافت الٰہیہ کا حامل ہے۔ خلافت الٰہیہ کا حامل ہونے کی صلاحیت اس میں علم کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ جیسا کہ قصہ آدم سے واضح ہوتا ہے ''وعلم آدم الأسماء کلھا ''لہٰذا علم اور عدل یہ دونوں انسان کے مقصد وجود سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کی ملائکہ اور دیگر مخلوقات پر برتری، انسان کا مقام ومرتبہ اور انسان کی حیثیت علم ہی کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ اور انسانوں کی ہدایت کے لیے جو شریعت دی گئی اس کا سب سے اہم اور اولین مقصد عدل ہے۔ گویا آغاز علم اور انتہا عدل ہے۔ عدل پر اس سلسلہ میں گفتگو آگے چل کر ہوگی۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے اس کے تین درجے ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے جو فرض عین کہلاتا ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس درجے کو بیان کرنے کے لیے تین عنوانات اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ ایک عنوان ہے ''ما تصح بہ العقیدۃ ''یعنی علم کا، علم دین کا، علم شریعت کا اتنا حصہ جس کے ذریعہ انسان کا عقیدہ اور ایمان درست ہو جائے۔ ایمان مفصل اور ایمان مجمل کی اصطلاحات متقدمین اسلام نے علم کے اس درجے کو آسان بنانے کے لیے اور اس کو ایک کیپسول میں بند کرنے کے لیے اختیار کی ہیں۔ دوسرا درجہ یا دوسری اصطلاح ہے ''ما تصح بہ العبادۃ ''ہر انسان پر عبادت فرض ہے۔ آج ایک شخص اس وقت مسلمان ہو تو چند گھنٹوں کے بعد اس پر ظہر کی نماز فرض ہو جائے گی۔ اسی طرح سے چند مہینے بعد رمضان کا مہینہ آئے گا اور روزے رکھنے پڑیں گے۔ اگر صاحب استطاعت ہے تو چند مہینے بعد حج کا موسم آ جائے گا تو حج

کرنا چاہیے۔ اگر صاحب استطاعت ہے تو سال بھر بعد زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ اس لیے عبادات سے مفر کسی مکلف انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ماتصح بہ العبادۃ بھی ضروری ہے۔ یعنی شریعت کا اتنا علم ضرور حاصل ہونا چاہیے کہ لازمی اور ضروری عبادات انسان ادا کر سکے۔

تیسرا درجہ ہے 'ما تصح به المعيشة'' جس کے ذریعے اس کی معاش اور زندگی درست ہو جائے۔ اس درجے میں شریعت کا علم بھی شامل ہے اور دنیا کا علم بھی۔ انسان کا تعلق جس پیشے سے ہے یا معاشرے کے جس دائرۂ کار سے ہے اس دائرۂ کار کا علم ضروری ہے۔ اگر کوئی انسان متعلقہ اور ضروری علم کے بغیر کوئی پیشہ اختیار کرتا ہے تو اوّل تو وہ کامیاب نہیں ہوگا اور اگر مادی اعتبار سے کامیاب ہو بھی جائے تو یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے جو وہ اپنی ذات اور دوسروں کے لیے پیدا کر رہا ہے۔ اس خطرے کے نتیجے میں اگر کسی کو نقصان ہو گیا تو شریعت اس کو تاوان ادا کرنے کا مکلف قرار دے گی۔ ایک حدیث ہے جس میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی انسان نے طب کا پیشہ اختیار کیا اور وہ علم طب نہیں جانتا تھا اور اس سے کسی کا نقصان ہو گیا تو اس شخص کو تاوان دینا پڑے گا۔ کسی کی جان ضائع ہو گئی تو اس کو دیت دینی پڑے گی۔ اسی طرح سے دوسرے معاملات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کسی بھی چیز کا فنی علم جو اس دور، اس زمانے اور اس علاقے کے لحاظ سے ناگزیر ہو اس کو حاصل کرنا بھی شریعت کی رُو سے لازمی ہے، اور خود اس میدان کے بارے میں شریعت کا علم بھی ضروری ہے۔ ایک شخص زراعت کا کام کرتا ہے تو جہاں زراعت کے طور طریقے اس کو جاننے چاہئیں وہاں اس کو زراعت کے بارے میں شریعت کے احکام بھی جاننے چاہئیں۔ ایک شخص تجارت کا پیشہ اختیار کرتا ہے تو جہاں رائج الوقت تجارت کے طریقے اس کو آنے چاہئیں وہاں اس کو تجارت کے اسلامی احکام بھی جاننے چاہئیں۔

یہ تو علم کا وہ حصہ ہے جو ہر شخص اور ہر فرد کو لازمی طور پر حاصل کرنا چاہیے۔ علم کا دوسرا حصہ وہ ہے جسے فقہائے اسلام نے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ فرض کفایہ میں بھی یہ دونوں چیزیں شامل ہیں۔ شریعت کا علم بھی شامل ہے اور دنیا کا علم بھی۔ دنیا کے علم کے سلسلے میں امام غزالی، علامہ ابن تیمیہ اور دوسرے اکابرین اسلام نے لکھا ہے کہ ان تمام علوم وفنون، ان تمام صنعتوں اور مہارتوں کا جاننا مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے جن کی امت مسلمہ کو ضرورت ہو اور جن

کے نہ جاننے کی وجہ سے امت مسلمہ کی خودکفالت مجروح ہو، اور امت مسلمہ دوسروں کی دست نگر ہو جائے۔ اس طرح کے علوم وفنون، صنعتیں اور مہارتیں ہر دور کے لحاظ سے بدلتی رہیں گی۔ ہر دور کے لحاظ سے جن مہارتوں کی امت مسلمہ کو ضرورت ہوگی، خاص طور پر امت مسلمہ کی آزادی اور خودمختاری کے تحفظ کے لیے جو ضروری مہارتیں درکار ہوں وہ مہارتیں حاصل کرنا امت کے لیے فرض کفایہ ہوگا۔

اسی طرح شریعت کی مہارت کا وہ درجہ حاصل کرنا بھی فرض کفایہ ہے جہاں عامۃ الناس کو ضروری دینی رہنمائی حاصل ہو سکے، عامۃ الناس اپنے ان مسائل کا جواب معلوم کرسکیں جن کا جواب ہر شخص کے پاس نہیں ہوتا، جو لازمی دینی تعلیم کی سطح سے ماوراء چیزیں ہیں، ان کا علم معاشرے میں کچھ لوگوں کے پاس ہونا چاہیے۔ ابھی میں نے عرض کیا کہ شریعت ایک خالص عملی نظام ہے۔ شریعت غیر عملی مطالبے نہیں کرتی۔ شریعت انسانوں سے وہ کچھ کرنے کو نہیں کہتی جو انسان کے بس میں نہ ہو "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعھا۔" شریعت ہر ایک سے یہ نہیں کہتی کہ ہر شخص فقیہ و مجتہد ہو جائے۔ امام ابوحنیفہ اپنے زمانے میں ایک ہی تھے۔ مفکرین اسلام میں سے جس کا بھی نام لیں ان کی مثال ان کے زمانے میں یا تو وہ خود ہی تھے یا ان جیسے چند اور حضرات تھے۔ مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت علم وفکر کی اس سطح پر نہیں تھی جس طرح پر اپنے زمانے میں امام غزالی، امام رازی، شاہ ولی اللہ یا اور دوسرے حضرات تھے۔ حتیٰ کہ خود صحابہ کرام میں سب کی سطح ایک نہیں تھی۔ صحابہ کرام کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار یا چوبیس ہزار صحابہ تو وہ تھے جنہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ آخری حج میں شرکت کی۔ حضور ﷺ کا دیدار مبارک کیا۔ ظاہر ہے ان سب صحابہ کرام میں سے ہر ایک شیخین کے مقام و مرتبہ کا حامل نہیں تھا، ہر ایک علم و فضل کے اس درجے پر نہیں تھا جس پر حضرت علیؓ فائز تھے۔ ہر ایک تفقہ اور فقہی معاملات اور شریعت کے عملی معاملات میں مہارت کا وہ درجہ نہیں رکھتا تھا جو درجہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یا حضرت معاذ بن جبل کا یا دوسرے صحابہ کبار کا تھا۔

اس لیے شریعت ہر ایک سے یہ نہیں کہتی کہ ہر شخص تفقہ اور مہارت کے اس مقام پر فائز ہو جس پر بہت تھوڑے لوگ فائز ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہر مسلم معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہونے چاہییں جن سے امت مسلمہ رجوع کر سکے، امت مسلمہ اپنی رہنمائی کے لیے ان کے علم

سے فائدہ اٹھا سکے۔

اس درجے کی بھی دو سطحیں ہیں، ایک سطح تو نسبتاً عام اور نچلے درجے کی سطح ہے جو عامۃ الناس کے لیے درکار ہے۔ ایک عام انسان کو آئے دن ایسے مسائل سے واسطہ پیش آتا رہتا ہے جن کا جواب اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اس نے شریعت کا جو لازمی علم حاصل کیا ہے اس علم میں اس کا جواب نہیں ملتا۔ اس لیے اس کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی بڑے صاحب علم سے راہنمائی حاصل کرے۔ یہ ضرورت کسی کو کم محسوس ہوتی ہے کسی کو زیادہ، کسی کو روزانہ، کسی کو کبھی کبھی، کسی کو کثرت سے کسی کو شاذ و نادر انداز میں، لیکن اس بات کی ضرورت سب کو پڑتی ہے کہ کسی صاحب علم سے رہنمائی حاصل کریں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے شریعت نے حکم دیا ہے کہ ہر گروہ، ہر جماعت، ہر طبقہ، ہر بستی، ہر شہر میں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہییں جن کی تعداد کا تعین اسی بستی یا اس علاقے یا اس گروہ کی ضروریات کے لحاظ سے ہوگا۔ جو دین میں گہری بصیرت رکھتے ہوں، "لیتفقهوا فی الدین" سب کا اس کام کے لیے نکلنا ضروری نہیں، کچھ لوگ نکلیں۔ ایک، دو، تین، پانچ، دس، پندرہ حسب ضرورت ایسے لوگوں کا نکلنا کافی ہے جو دین میں گہرا ادراک حاصل کریں، گہری بصیرت اور تفقہ حاصل کریں اور یہ حاصل کرنے کے بعد اپنے لوگوں کو جس طبقے سے وہ گئے ہیں اس طبقے کے لوگوں کو دینی رہنمائی دے سکیں۔

یہ بات امت مسلمہ کے ذمہ فرض کفایہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے کہ معاشرے میں ایسے لوگ موجود رہیں، معاشرے میں شریعت کے ایسے ماہرین موجود ہوں جو عامۃ الناس کی رہنمائی کا فریضہ کما حقہ انجام دے سکیں۔ جس طرح امت مسلمہ کے ذمے یہ فرض کفایہ ہے کہ اس میں طب کے ماہرین ایسی تعداد میں موجود ہوں جو عامۃ الناس کا علاج کر سکیں۔ ایسے مہندسین موجود ہوں جو فنی امور اور انجینئرنگ کے معاملات میں امت کی ضرورت کو پورا کر سکیں، ایسے ماہرین تعمیرات موجود ہوں جو امت کی تعمیری ضروریات کو پورا کر سکیں، ایسے ماہرین موجود ہوں جو مختلف میدانوں اور فنون میں مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کر سکیں، یہ بات صرف شریعت کی مہارتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ تمام مہارتوں کے ساتھ ہے۔ شریعت کے بارہ میں ان مہارتوں کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے، اس لیے کہ انسان کی اور مسلمان کی پوری زندگی کا دار و مدار شریعت پر اور اسلام سے وابستگی پر ہے۔

اس باب میں ایک شافعی فقیہ علامہ خطیب الشربینی نے اور دوسرے متعدد شافعی فقہاء نے بڑی اہم اور دلچسپ بات لکھی ہے، ممکن ہے دوسرے فقہی مکاتب کے حضرات نے بھی لکھی ہو، شافعی فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ ہر عدوی کی مسافت پر ایک مفتی مقرر کیا جائے۔ ایک ایسا عالم جو دینی معاملات میں رہنمائی یا فتویٰ دے سکے وہ ہر عدوی کی مسافت پر موجود ہونا چاہیے۔ عدوی سے مراد انہوں نے یہ لی ہے کہ اتنی مسافت یا اتنا رقبہ یا علاقہ جس میں کوئی شخص صبح فجر کی نماز کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر پیدل روانہ ہو، متعلقہ ماہر شریعت، عالم یا مفتی سے ملاقات کرے۔ پیدل جا کر، اپنا مسئلہ بیان کرے، رہنمائی حاصل کرے اور غروب آفتاب سے پہلے پہلے پیدل اپنے گھر واپس آ سکے۔ یہ شرط اس لیے رکھی کہ ہر شخص کے پاس سواری نہیں ہوتی، بہت سے لوگوں کو پیدل ہی آنا جانا پڑتا ہے۔ شریعت کسی شخص کو ایسی چیز کا مکلف نہیں کرتی جس پر عمل کے وسائل اس کے پاس نہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص کے پاس آج گاڑی ہو، ضروری نہیں کہ ہر شخص کے پاس قدیم زمانے میں گھوڑا یا خچر یا اُونٹ موجود ہو۔ اس لیے ایک صحت مند انسان، ایک عام صحت کا انسان کم از کم اس زمانے میں ایسا تھا کہ پیدل جائے تین، چار، پانچ میل، آٹھ میل اور جا کر رہنمائی حاصل کر کے واپس آ جائے۔ اس فاصلہ تک جانے آنے میں کوئی زحمت نہیں ہے، کوئی مشقت نہیں ہے، کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسے مسائل روز پیش نہیں آئیں گے، کبھی کبھار ہی پیش آئیں گے۔ کبھی کبھار اس طرح کا سفر اختیار کر کے چلا جانا یہ کوئی پُر مشقت بات نہیں ہے۔

آج کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ذرائع مواصلات کثرت سے ہیں، وسائل نقل تیز رفتار اور عام ہیں اور ہر شخص کو دستیاب ہیں، کہ ہر بڑے شہر میں کم از کم چند ایسے اہل علم موجود ہونے چاہییں جن تک عامۃ الناس رہنمائی کے لیے رجوع کر سکیں۔ ہر چھوٹی بستی میں ایک ایک دو دو ایسے حضرات ایسے ہونے چاہییں۔ اگر حکومتیں یہ انتظام کریں۔ ایسے تعلیمی ادارے قائم کریں، اسلامی تحقیق اور تعلیم کے اعلیٰ ادارے ہوں، جامعات ہوں، کلیات سرکاری اور حکومتی وسائل سے قائم ہوں تو فبہا۔ ورنہ اگر حکومتیں اس میں کوتاہی کریں گی تو وہ اللہ کے یہاں جوابدہ ہوں گی۔ لیکن عامۃ الناس اس ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہوں گے۔ پھر ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود آگے بڑھیں اور غیر سرکاری ادارے قائم کریں۔ جہاں جہاں ایسے غیر

سرکاری ادارے قائم ہیں، جیسے الحمدللہ پاکستان میں، تو ان کی مدد کرنا، ان اداروں کو مزید ترقی دینا یہ عامۃ الناس کی ذمہ داری ہے۔

فرض کفایہ کے اس درجے کے ساتھ ایک درجہ اور بھی ہے جو فرض کفایہ کا بھی فرض کفایہ ہے۔ یہ وہ درجہ ہے کہ جہاں خود اہل علم کو رہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ اہل علم جو عامۃ الناس کی رہنمائی کر رہے ہوں، اگر خود ان کو رہنمائی کی ضرورت پیش آجائے تو وہ کہاں رجوع کریں۔ مزید یہ کہ ایسے نئے معاملات ومسائل جو امت مسلمہ کو پیش آئیں ان کا جواب امت مسلمہ کہاں سے معلوم کرے۔ بعض مسائل ایسے ہو سکتے ہیں کہ یہ ماہرین اور مفتی حضرات جو جگہ جگہ، بستی بستی، گاؤں گاؤں دستیاب ہیں وہ مسائل ان کی سطح سے اوپر کے ہوں۔ اگر ان کی سطح سے اوپر کے مسائل پیش آجائیں تو اس کے لیے چند افراد ایسے بھی امت مسلمہ میں ہونے چاہییں جو ان نئے معاملات کا جواب دے سکیں۔ اجتہادی بصیرت کے حامل ہوں۔ ماہرانہ اور ناقدانہ انداز سے دور جدید کے مسائل ومشکلات کو جانتے ہوں۔ اپنے زمانے کی ضروریات اور تقاضوں سے واقف ہوں۔ زمانے کے رجحانات پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ وقت کے نبض شناس ہوں۔ فقہ وشریعت کے مزاج شناس ہوں۔ دین میں گہری بصیرت رکھتے ہوں۔ قرآن پاک، سنت رسول اور شریعت کے پورے ذخیرے سے ماہرانہ انداز میں واقف ہوں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ بڑی تعداد میں نہیں ہوں گے۔ ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوں گے۔ ماضی میں بھی تھوڑے تھے۔ ابھی میں نے مثال دی کہ امام ابوحنیفہ اپنے زمانے میں ایک ہی تھے یا ان جیسے چند اور حضرات ہوں گے، لیکن ایسے ماہرین اُس زمانہ کے اعتبار سے بھی بہت تھوڑے تھے۔ یہ فرض کفایہ کا ایک بہت اُونچا درجہ ہے۔ شریعت کے معاملات میں بلکہ شریعت کے علاوہ دیگر تمام معاملات میں بھی ایسے حضرات کی دستیابی کا بندوبست کرنا امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ یہ تو فرائض کے وہ درجات ہیں جو علم کے بارے میں شریعت قرار دیتی ہے۔ عدل کے بارے میں بعد میں بات کریں گے۔

ان لازمی تقاضوں کے ساتھ ساتھ شریعت علوم وفنون کی ترقی، فکر کی وسعت، ادب اور تہذیب کی ترقی کو پسند کرتی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے وسائل فراہم کرنے کو پسندیدہ اور مستحسن قرار دیتی ہے۔ لیکن یہ علم کا وہ درجہ ہے جس کو بعض

بزرگوں نے علم کی چٹنی قرار دیا ہے۔ امام شاطبی کے الفاظ میں یہ ملح العلم ہیں۔ مثال کے طور پر خالص ادبیات کے معاملات، احکام شریعت سے نکلنے والے بہت سے ایسے پہلو جن کا درجہ حکمت اور مصلحت کی دریافت کا ہے، یا زبان وادب کی نزاکتیں ہیں۔ بزرگوں کے طرز عمل سے استناد کا معاملہ ہے، تصوف کے بعض درجات ہیں۔ کسی خاص علم وفن کے میدان میں خصوصی استفادے کے معاملات ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر ساری قوم ان تفصیلات ہی کے حصول پر لگ جائے تو علم وفکر کا توازن بگڑ جائے گا، ایسی صورت میں عدم توازن پیدا ہو جاتا ہے اور معاشرہ صحیح رُخ پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ہم برصغیر کی مثال لیں، برصغیر میں جب مسلمانوں کا دور زوال تھا، دور انحطاط تھا تو ہر پڑھا لکھا آدمی، معاشرے کا ہر تعلیم یافتہ فرد شعر وشاعری پر لگا ہوا تھا۔ شعر وشاعری ہی ہندوستان کے لوگوں کا اٹھنا بیٹھنا تھی۔ شریعت شعر وشاعری کو ناپسندیدہ نہیں قرار دیتی۔ صحابہ کرام میں بھی شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات موجود تھے۔ سیدنا عمر فاروقؓ شعر وادب کے بڑے عالم تھے، حضرت علی بن ابی طالبؓ خود بھی کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ شعر وادب سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو بہت سے شعر یاد تھے۔ لیکن ان کی حیثیت ملح العلم کی تھی۔ ان بزرگوں کے اِس طرز عمل سے واضح ہوتا ہے کہ عرب جاہلیہ کے وہ اشعار جو قرآن پاک یا سنت کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہوں ان سے شغف رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ علم کا وہ درجہ تھا جس کو علمائے اسلام نے دسترخوان علم کی چٹنی یا ملح العلم سے تشبیہ دی ہے۔ یہ وہ معاملات ہیں جو نہ عامۃ الناس کے لیے فرض ہیں، نہ علمائے کرام کے لیے ناگزیر اور ضروری ہیں، نہ اجتہاد اور استنباط میں براہ راست ان کی کوئی ضرورت ہے۔ لیکن یہ علم ودانش کے وہ پہلو ہیں جن سے اسلامی تہذیب کی تکمیل ہوتی ہے، جن سے اسلام کی فکری اور علمی ثقافت کی شان میں اضافہ ہوتا ہے اور علوم وفنون کی نئی نئی جہتیں اور نئی نئی ترقیات سامنے آتی ہیں۔ اس لیے اگر علماء کرام میں سے کچھ لوگ اور اہل علم کی ایک محدود تعداد ان مسائل سے اعتناء کرے تو وہ شریعت کی نظر میں ایک پسندیدہ کام ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کی بڑی تعداد یا مسلمانوں کا بیشتر حصہ اپنی توجہ کو ان چیزوں پر مرکوز کر لے تو پھر نہ صرف دین بلکہ زندگی کے دوسرے اہم پہلو متاثر ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اور علم وفکر کی دنیا کے وہ اہم معاملات متاثر ہو

سکتے ہیں جن پر دینی یا دنیوی کامیابی کا دارومدار ہے۔

شریعت کے بارے میں یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے اور قرآن پاک میں کئی جگہ اس کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جہاں تک دین کے اصولوں کا تعلق ہے یہ تمام انبیاء علیہم السلام میں مشترک رہے ہیں۔ اور تمام آسمانی کتابوں میں، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں، اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آنے والے پیغام میں انہی اصولوں کی تعلیم تھی اور اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے ان اصول اور انہی بنیادوں کی تفصیل بیان کی۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ مکتوبات میں، مکتوبات کی جلد اوّل کے مکتوب نمبر ۶۳ میں، اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اصول دین میں کس طرح متفق ہیں اور اصول دین میں اتفاق کے بعد شرائع میں اختلاف اور شرائع میں تفصیلات کس طرح متنوع ہوتی ہیں۔ یہ بات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے، امام شاطبی نے، امام غزالی نے، علامہ ابن تیمیہ نے اور شریعت کے متعدد مزاج شناسوں نے تفصیل سے بیان کی ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ جو بات پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ شریعت کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ بنیادی مقصد ہے تو غلط نہ ہوگا۔ کہ انسانوں کو ان کی ذاتی پسند ناپسند، اپنی مادی مصلحتوں اور ذاتی مفادات کے دائرے سے نکال کر ایک ہمہ گیر الٰہی شریعت کے نظم میں لایا جائے، یہ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ایک یا سب سے بڑا بنیادی مقصد ہے۔

امام شاطبی نے اس کے لیے اصطلاح استعمال کی ہے ''اخراج المکلف عن داعیة الھوی'' کہ جتنے مکلّف انسان ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کی ذمہ داری کا مکلّف بنایا ہے ان سب کو ہوی اور ہوس اور خواہشات نفس کے دائرے سے نکال کر شریعت کے دائرے میں لانا، یہ شریعت کا بنیادی مقصد ہے۔

مقاصد پر گفتگو کے ساتھ ساتھ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مقاصد کی تعبیر اگر انسان اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر کرنے لگے، انسانی جان اور مال کا تحفظ اگر ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کے

پیش نظر، ہر قوم اپنے قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے، ہر قبیلہ اور ہر برادری اپنے گروہی مفاد کے نقطۂ نظر سے کرنے لگے تو یہ شریعت کے مقاصد کی تکمیل نہیں ہوگی، بلکہ شریعت کے مقاصد سے انحراف ہوگا۔ اس لیے کہ یہ تمام محرکات وہ ہیں جو داعیہ ہوی یعنی خواہشات نفس پر مبنی ہیں۔ اس لیے شریعت نے سب سے پہلے جس چیز کا راستہ روکا ہے، وہ ہوی وہوس کا راستہ ہے جس سے انسانوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عقائد سے کام لیا گیا، اخلاق سے بھی کام لیا گیا، روحانی اور دینی تربیت سے بھی کام لیا گیا، اور پھر آخر میں شریعت کے احکام کا رجحان بھی یہی ہے کہ انسانوں کو ذاتی مفاد، ذاتی خواہشات اور ذاتی پسند ناپسند کے استعمال کے لیے حدود کا پابند بنایا جائے۔ یہاں تک کہ اگر کسی نیک کام میں بھی ذاتی مفاد شامل ہو جائے، کسی عبادت میں بھی نفسانی خواہشات شامل ہو جائیں، دنیاوی مصلحتیں شامل ہو جائیں، تو اس کا راستہ بھی بڑا خطرناک ہوتا ہے اور وہ چیز محمود سے بالتدریج مذموم تک لے جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز سب سے افضل عبادت ہے۔ لیکن اگر نماز ریاکاری کی خاطر پڑھی جانے لگے، نماز اس لیے پڑھی جانے لگے کہ لوگ بزرگ اور ولی قرار دیں تو یہ عمل بہت غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہ خالص روحانی چیز بھی شریعت کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ ہو جاتی ہے۔

اگر ایک مرتبہ ہوی اور ہوس کا راستہ کھل جائے تو اس سے حیلوں کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اور انسانی ذہن اور مزاج ایسے ایسے طریقے سجھاتا ہے جس میں شریعت کے ظواہر کی پابندی تو نظر آئے لیکن شریعت کے مقاصد اور اہداف ایک ایک کر کے مجروح ہو جائیں۔

یہ وہ بنیادی قواعد اور تصورات ہیں جن پر شریعت الٰہی کا دارومدار ہے۔ ان بنیادی قواعد و کلیات سے علمائے کرام کی بڑی تعداد نے بحث کی ہے۔ ان مباحث میں جن اہل علم کا نام بہت نمایاں ہے ان میں امام غزالی، امام رازی، امام قرافی، علامہ عزالدین بن عبدالسلام السلمی، علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن القیم، امام شاطبی، اور ان سب کے ساتھ ساتھ ہمارے برصغیر کے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی شامل ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے پہلے حصے میں ان قواعد اور بنیادی تصورات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے جن سے شریعت کے اہم اور بنیادی مقاصد مستنبط ہوتے ہیں۔ ان مقاصد کی بنیاد پر وہ

مصلحتیں دریافت کی جاتی ہیں جن پر احکام شریعت کا دارومدار ہے۔

شاہ ولی اللہ کا کام اس نقطہ نظر سے انتہائی اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اپنا مخاطب صرف مسلمانوں کو نہیں بنایا، بلکہ اپنے زمانے کی پوری علمی دنیا کو اور دنیا کے تمام مفکرین کو مخاطب بنایا۔ انہوں نے اپنی گفتگو کی اٹھان ان اصولوں پر رکھی جو اس زمانے کے لحاظ سے علمی دنیا کے طے شدہ اصول اور طے شدہ تصورات تھے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے بتایا کہ تکلیف شرعی کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کیوں کسی کو مکلف بناتا ہے؟ اور تکلیف یا مکلف بنائے جانے سے مراد کیا ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے جو سلسلہ مجازات رکھا ہے، جزا اور سزا کا نظام تجویز کیا ہے، وہ کیوں کیا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ اس زندگی میں جزا اور سزا کے اس تصور کی کیا اہمیت ہے، آخرت کی زندگی میں اس سزا اور جزا کی نوعیت کیا ہوگی؟ ظاہر ہے کہ اس ساری گفتگو کا تعلق انسانی زندگی اور اس کے ارتقاء سے بہت گہرا ہے، پھر جب دنیا میں جزاء و سزا کی بات ہوگی تو یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ انسانی ذہنی اعتبار سے کس سطح پر کھڑا ہے۔ تہذیب و تمدن کے کس مقام پر ہے اور اپنی ذہنی سطح، فکری بلندی اور عام طرز زندگی کے اعتبار سے کتنی نفاست اور نزاکت کا مالک ہے۔

تہذیب و تمدن کی ان سطحوں کو شاہ ولی اللہ نے ارتفاقات کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ ارتفاق کا لفظ جو شاہ صاحب کے یہاں استعمال ہوا ہے۔ نسبتاً نیا ہے۔ بہت سے حضرات کو اسے سمجھنے میں الجھن پیش آئی ہے۔ لیکن اس سے مراد تہذیبی ارتقاء کے وہ مظاہر ہیں جو انسانی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے مطالعہ تاریخ سے یہ نتیجہ نکالا کہ تمدنی پیش رفت کے یہ مدارج یا تہذیبی ارتقاء کے یہ مراحل چار ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ وہ ہوتا ہے جب انسان بہت ابتدائی زندگی سے ایک قبائلی زندگی کی طرف قدم بڑھا رہا ہوتا ہے۔ اور انسانی زندگی اپنے تمدن اور تہذیبی معیار کے اعتبار سے بہت ابتدائی سطح پر ہوتی ہے۔ یہ ابتدائی سطح بھی وہ ہوتی ہے جس میں کچھ اصول مشترک ہوتے ہیں، کچھ اخلاقیات اور روحانیات کے آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں اور کوئی انسانی معاشرہ ان سے خالی نہیں ہوتا۔

یہاں شاہ صاحب نے ان مغربی ماہرین کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا ہے، جنہوں نے بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی علمی بنیاد کے انسانوں کے آغاز کے بارے میں بہت سی بے سروپا

باتیں فرض کر لی ہیں۔ انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ انسان اپنے آغاز میں انتہائی وحشی اور بدتہذیب تھا اور حیوانی انداز کی زندگی رکھتا تھا۔ انہوں نے یہ بھی فرض کر لیا کہ انسان کسی اخلاق اور قاعدے کا پابند نہیں تھا۔ یہ محض مفروضات ہیں جن کی کوئی علمی یا تاریخی اساس نہیں ہے۔ چونکہ آج دنیائے مغرب میں لامذہبیت اور سیکولرازم کا چلن ہے، مذہب سے دُوری اور نفرت عام ہے اس لیے مغربی ذہن ان تصورات کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ اس لیے یہ تمام تخمینے اور بے بنیاد اندازے مغربی دنیائے علم میں مسلمات کا درجہ پا گئے۔

شاہ صاحب کی تحریروں بالخصوص ارتفاقات کی بحث میں ایک نیا نقطہء نظر سامنے آتا ہے جس کی اساس گہرے شعور، مطالعے اور عقلی اصولوں پر ہے۔ ارتفاقات کے اس تصور کی بنیاد پر شاہ صاحب سعادت سے بحث کرتے ہیں۔ سعادت سے مراد وہ ہدف اولین ہے یا وہ مقصد آخرین ہے جو ہر انسان پیش نظر رکھتا ہے۔ سعادت کی اصطلاح قریب قریب (happiness) کی اصطلاح کے متوازی اصطلاح ہے جو مغربی مفکرین اور یونانیوں نے اختیار کی تھی۔ قدیم یونانی فلاسفہ اور رومن مفکرین کے نزدیک خوشی یا مسرت انسانوں کے لیے مقصد عظمیٰ یا نعمت عظمیٰ کی حیثیت رکھتی ہے جس کو مغربی فکر کی اصطلاح میں ''سمم بونم'' (Summum Bonum) کہتے ہیں۔ اگر یہ نعمت عظمیٰ Happiness یا خوشی ہے تو خوشی اور مسرت عام طور پر ایک مادی اور حیوانی شعور یہ جسمانی احساس سے عبارت ہوتی ہے جس کا تعلق بہت آسانی سے خواہشات نفس اور ہوی وہوس سے جوڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خود قدیم یونانیوں میں جہاں happiness یعنی خوشی کو انسانوں کا مقصد اصلی قرار دیا گیا وہاں بہت جلد ایسے تصورات پیدا ہو گئے جہاں صرف مادی آسائش، مادی خوشی اور مادی لذتوں کے حصول ہی کو انسان کا مقصد قرار دیا گیا تھا۔

مفکرین اسلام نے خوشی یا happiness یا اس کے مترادف کوئی اصطلاح استعمال نہیں کی، بلکہ سعادت کی خالص قرآنی اصطلاح استعمال کی، سعید اور سعادت خالص قرآنی اصطلاحات ہیں۔ شقی اور سعید کی تقسیم قرآن مجید نے جابجا کی ہے۔ اس لیے سعادت کی اصطلاح میں جو گہری روحانیت، واضح اخلاقی اقدار اور جامعیت ومعنویت پائی جاتی ہے وہ کسی اور اصطلاح میں نہیں پائی جاتی۔ اسی روایت کو اختیار کرتے ہوئے شاہ صاحب نے سعادت کی

اصطلاح استعمال کی ہے اور یوں انہوں نے سعادت کا سلسلہ (جو خالص فلسفیانہ تصور کے طور پر سامنے آئی تھی) علم کلام اور مقاصد شریعت سے جوڑا ہے۔ ایک طرف شاہ صاحب اس کا رشتہ بر و اثم کی بحث سے جوڑتے ہیں یعنی کس چیز کو شریعت میں گناہ قرار دیا گیا اور کس چیز یا کس عمل کو شریعت میں نیکی قرار دیا گیا۔ دوسری طرف سعادت کی بحث کو مقاصد شریعت سے وابستہ کرتے ہیں۔

نیکی اور بدی عقائد اور کلام کے اہم موضوعات ہیں، اخلاق اور روحانیات کے بنیادی موضوعات ہیں۔ لیکن ان اخلاقیات اور کلامیات کے موضوعات کا انتہائی گہرا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی یعنی سیاسیات ملیہ سے ہے جس سے مقاصد شریعت اُبھرتے ہیں اور شریعت کے سارے احکام کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغۃ کے پہلے حصے میں مقاصد شریعت یا مصالح احکام کی ایک ہمہ گیر فکری، تہذیبی، علمی اور تمدنی بنیاد فراہم کر دی ہے۔ یہاں شاہ ولی اللہ اپنے تمام متقدمین اور معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

شریعت کے مقاصد اور مصالح پر جب گفتگو ہوتی ہے تو یہ بات بعض لوگ بھول جاتے ہیں کہ ان مصالح اور مقاصد کا تعلق صرف اس دنیوی زندگی سے نہیں ہے، بلکہ دراصل ان سب کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے۔ اس لیے کہ شریعت کا مزاج اور بنیادی مقصد اور تکلیف شرعی کا اصل مقصد اور ہدف انسان کی اخروی زندگی کو کامیاب بنانا اور اس دنیا کی زندگی کو اس اعتبار سے منظم اور مرتب کرنا ہے کہ آخرت میں اس کے مثبت اثرات ہوں، یہ مقاصد شریعت اور مصالح شریعت کا بنیادی ہدف ہے۔

شریعت کے یہ اصول و قواعد قطعی اور یقینی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی بنیاد کلیات شرعیہ پر ہے جو قطعی الثبوت بھی ہیں اور قطعی الدلالت بھی ہیں۔ دوسری طرف اصول عقلیہ سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے اور واضح بات ہے کہ جو چیز عقل کے اعتبار سے بھی قطعی الثبوت ہو اور نقل کے اعتبار سے بھی قطعی اور یقینی طور پر ثابت شدہ ہو اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان قطعی کلیات کے ذیل میں آنے والے جزئیات اور فروع بھی سب ایک ایک کر کے قطعی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے، بعض فروع ظنی بھی ہو سکتے ہیں

جیسا کہ شریعت کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ لیکن کسی فرعی معاملے یا جزئی مسئلے کے ظنی ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ جزئیات اور یہ فروع جن کلیات کے تحت آ رہے ہیں وہ کلیات قطعی نہیں ہیں۔

اسلامی شریعت نے، جیسا کہ عرض کیا گیا۔ زندگی کے ہر پہلو اور انسانی زندگی کے تمام ممکنہ تقاضوں سے اعتنا کیا ہے۔ جس طرح انسان کے جسم کو غذا اور دوا دونوں کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح انسان کے دل کو بھی غذا اور دوا دونوں کی ضرورت ہے۔ شریعت غذا بھی ہے، شریعت دوا بھی ہے، شریعت اپنے احکام اور اپنے عام اصول اور رہنمائی کے اعتبار سے انسانی دلوں کے لیے غذا ہے، انسانی دلوں کے لیے جلا ہے۔ انسان شریعت پر جتنا عمل کرتے جائیں گے ان کے دل اتنے صاف اور پاکیزہ ہوتے جائیں گے۔

دلوں کے صاف اور پاکیزہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کے حقائق سامنے رہیں، مقاصد سامنے رہیں۔ صرف ظاہری پابندی اور لفظی بازیگری پیش نظر نہ ہو، بلکہ دراصل شریعت کی روح پر عمل کرنے کی نیت ہو اور ظاہر اور باطن دونوں کو یکساں طور پر پیش نظر رکھا گیا ہو۔ یہ بات یاد رکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض صوفی شاعروں کے اسلوب بیان اور طرز کلام سے بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ شریعت قشر (چھلکے) کے مترادف ہے اور حقیقت لب (مغز) کے مترادف ہے۔ شریعت اور حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ شریعت ہی کی حقیقت پر عمل کرنے کو حقیقت اور شریعت کی محض ظاہرستانہ پابندی کو قشر کی اصطلاح سے یاد کیا گیا۔

شریعت کا بنیادی مقصد، جیسا کہ بتایا گیا۔ دلوں کے لیے غذا اور دوا دونوں کی فراہمی ہے۔ جس طرح دل کا تعلق انسان کے اعضاء و جوارح سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کے باطن کا تعلق بھی انسان کے ظاہر سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ باطن کے اثرات انسان کے ظاہر پر اور ظاہر کے اثرات انسان کے باطن پر ہوتے ہیں۔ یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے۔ انسان اپنے ظاہر میں بہت چیزوں سے متاثر ہوتا ہے جس کے اثرات اس کے باطن پر پڑتے ہیں۔ اسی طرح اس کے باطن میں بعض ایسے تصورات اور تاثرات پیدا ہوتے ہیں، ایسے احساسات اور جذبات جنم لیتے ہیں جن کے اثرات اس کے ظاہر پر فوراً ہی محسوس ہو

جاتے ہیں۔

اس لیے شریعت نے سب سے پہلے طہارت اور پاکیزگی دونوں پر زور دیتے ہوئے قلب اور جسم دونوں کی پاکیزگی اور ظاہر اور باطن دونوں کی طہارت کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن مجید نے جہاں جسم اور لباس کو ظاہری ناپاکیوں سے بچانے اور پاک کرتے اور پاک رکھنے کا حکم دیا ہے، جہاں جسم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانے کے لیے ہدایات دی ہیں وہاں قلب اور روح کو بھی اخلاقی رذائل سے پاک کرنے کا حکم دیا ہے۔ قلب اور ضمیر کو ماسوی اللہ کا مرکز بننے سے بچانا اور صرف اللہ کے لیے خاص کر لینا یہ قلب وضمیر کی پاکیزگی ہے۔ پاکیزگی اور طہارت کے یہ چہارگانہ مراحل امام غزالی نے بہت تفصیل سے اپنی متعدد کتابوں میں بیان کیے ہیں۔ یعنی:

۱۔ جسم ولباس کو ظاہری ناپاکیوں سے بچانا اور پاک کرنا۔

۲۔ جسم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانا۔

۳۔ قلب اور روح کو اخلاقی رذائل سے پاک کرنا۔

۴۔ قلب اور ضمیر کو ماسوی اللہ کا مرکز بننے سے بچانا اور صرف اللہ کے لیے خاص کر لینا۔

جب انسان ظاہری اور باطنی طور پر پاکیزگی اختیار کر لیتا ہے تو پھر وہ اللہ کی عبادت کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شریعت کے احکام میں سب سے اولین حکم، اور مقاصد میں سب سے پہلا مقصد اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کو مضبوط بنانا ہے۔ یوں تو تعلق کی یہ مضبوطی شریعت کے سارے احکام کا مقصد ہے اور شریعت کے ہر حکم پر عمل کرنے سے یہ تعلق مضبوط ہوتا ہے، بشرطیکہ اللہ کے حکم کی پابندی کا عزم کرتے ہوئے اور اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر احکام شریعت پر عملدرآمد کیا جائے۔ لیکن خاص طور پر جن اعمال واحکام کو عبادات کہا جاتا ہے ان کا تو سب سے اولین مقصد یہی ہے۔ انسانوں کو عبادت کے لیے آمادہ کرنے کی خاطر اور یہ بتانے کی خاطر کہ جب انسان اللہ کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اور اللہ کی عبادت کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے کو ان تمام کائناتی قوتوں کا ہم سفر بنا لیتا ہے جو اللہ کے حکم پر عمل پیرا ہیں اور کائنات کے اس نظام میں اللہ کے حکم کی فرمانبرداری کر رہی ہیں۔

یہ کائنات پوری کی پوری، یہ تمام سیارے، فلکیات، ثوابت یہ اللہ کے حکم پر عمل پیرا ہیں

اور اللہ کے حکم سے ذرہ برابر انحراف نہیں کرتے۔''**ولله يسجد من في السموات والأرض طوعا و كرها**''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کے حضور سجدہ ریز ہے، اپنی مرضی سے بھی اور بغیر مرضی کے بھی۔ وہ مجبور ہے کہ اللہ کے حکم کی پابندی کرے اور اللہ نے جس طرح سے اس کو اپنے حکم کا زیر نگین کیا ہے اس حکم پر کاربند رہے۔''**وإن من شيء إلا يسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبيحهم**''ہر شے زبان حال یا زبان قال سے یا اپنے طرز عمل سے اللہ کی تسبیح اور تحمید میں مصروف ہے۔ بعض انسانوں کو یہ تسبیح و تحمید سمجھ میں آتی ہے بعض کو نہیں آتی۔ لیکن اگر انسان عبادت کرتے ہوئے یہ شعور رکھے کہ وہ کائنات کی ان تمام قوتوں کے ساتھ شریک سفر ہے، ان کا ہم منزل ہے جو اللہ کے حضور رواں دواں ہیں تو اس کی عبادت میں ایک نئی معنویت اور ایک نئی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی پاکیزگی اور ظاہری طہارت کی بنیاد پر اسلامی شریعت انسانوں کی زندگی کو منظم اور استوار کرنا چاہتی ہے۔ ایک دفعہ اندرونی اور بیرونی پاکیزگی حاصل کرنے کے بعد جب انسان شریعت کے احکام پر عمل کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں ایک نیا انداز زندگی سامنے آتا ہے۔ اس نئے انداز سے ایک ایسی روحانی تہذیب قائم ہوتی ہے، ایک ایسا پاکیزہ تمدن اُبھرتا ہے جس کے بارے میں یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کی اساس پاکیزگی، اعمال کی صفائی، دلوں کی صفائی اور تعلق مع اللہ پر ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ روحانی اساس جس کی بنیاد پر شریعت کے احکام دیے گئے۔

یہ سوال فقہائے اسلام کے درمیان شروع سے زیر بحث رہا ہے کہ کیا اسلامی شریعت میں دیے جانے والے احکام، یعنی اوامر و نواہی کے کوئی مقاصد اور اہداف ہیں یا ان سب کا مقصد محض انسانوں کی آزمائش ہے۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ قرآن پاک میں کئی جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے موت و حیات کا یہ سارا سلسلہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہم آزما کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کون نیکوکار ہے اور کون بدکار ہے۔''**ليبلوكم ايكم احسن عملا**''اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتا ہے، ایک امتحان کرنا چاہتا ہے جس سے تمام مخلوقات کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ انسانوں میں نیکوکار کون ہے اور خطاکار کون۔

بعض مفکرین اسلام نے یہ رائے ظاہر کی کہ چونکہ اصل مقصد نیکوکاروں اور خطاکاروں کا

تعین ہے اس لیے فی نفسہ ہر ہر حکم میں کسی حکمت یا مقصد کا پایا جانا ضروری نہیں۔ بعض فقہائے اسلام نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی آقا اپنے ملازمین یا غلاموں کی دیانتداری کا امتحان لینا چاہے یا کارکردگی کا جانچنا چاہے اور اس کے لیے کوئی ذمہ داری ان کے سپرد کردے تو یہ ضروری نہیں کہ خود اس ذمہ داری یا اس کام میں بھی فی نفسہ کوئی حکمت یا مقصد موجود ہو، اس ذمہ داری یا کارِ مفوضہ کا یہ مقصد کافی ہے کہ اس کے ذریعے ملازمین یا خادموں کی دیانتداری جانچنا مقصود ہے۔ یہی کیفیت ان حضرات کی رائے میں شریعت کے احکام کی بھی ہے۔ اس لیے شریعت کے جزوی احکام میں کوئی حکمت یا مصلحت تلاش کرنا ان حضرات کے خیال میں غیر ضروری ہے۔

کچھ اور اہل علم جن پر توحید اور ذات الٰہی کے قادرِ مطلق ہونے کا تصور بہت زیادہ غالب تھا انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کو مصلحتوں کا پابند قرار دیا جائے یا مصلحتوں کی بنیاد پر صادر ہونے والا قرار دیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے خلاف ہے۔ کسی مصلحت یا مقصد کا پابند تو انسان ہوتا ہے، یا دوسری مخلوقات ہوتی ہیں جن کی صلاحیتیں محدود ہیں، اختیارات محدود ہیں، قوت محدود ہے، اس لیے وہ کسی نہ کسی مفاد یا مقصد کی خاطر کوئی کام کرتے ہیں۔ وہ ذات جو قادرِ مطلق ہو، جس کے اختیار اور قوت کی کوئی حد نہ ہو اس کو کسی قاعدے یا ضابطے کا پابند کرنا یا سمجھنا درست نہیں۔

ان چند انفرادی یا بہت اقلیتی آراء کے ساتھ ساتھ اہل علم کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام مصلحت اور مقصد پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات حکیم مطلق ہے اور "**فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ**" کسی حکیم کا فعل حکمت اور دانائی سے خالی نہیں ہوتا۔ جو ذات تمام دانائیوں اور حکمتوں کا سرچشمہ ہے اس کے فیصلے اور اس کے احکام حکمتوں سے کیسے خالی ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید کو اگر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید جہاں قانون ہے وہاں وہ حکمت بھی ہے، بشیر و نذیر بھی ہے اور ان تمام خصائص کا جامع ہے جو سابقہ آسمانی کتابوں میں رکھی گئیں۔ تورات کی بنیادی صفت تعلیم اور انذار معلوم ہوتی ہے۔ تورات میں قانون کے احکام دیے گئے اور یہودیوں کو ان کے انجام سے ڈرایا گیا۔ گویا انذار کی صفت تورات میں

نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔اس کے مقابلے میں انجیل قانون الٰہی کی حکمت پر زیادہ زور دیتی ہے۔اس نے برتر اخلاقی اصول پر روشنی ڈالی ہے اور آسمانی بادشاہت کی نویدیں سنائی ہیں۔ اس اعتبار سے انجیل تبشیر کا فریضہ انجام دیتی ہے۔قرآن مجید میں انذار بھی ہے اور تبشیر بھی ہے۔قرآن مجید میں قانون بھی ہے اور قانون کی حکمت بھی ہے۔قرآن مجید میں تورات کی طرح کے سخت قوانین بھی ہیں۔بعض قوانین بعینہ وہ ہیں جس طرح تورات میں آئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان قوانین کی برتر اخلاقی اور روحانی حکمت اور مقصد کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ قرآن مجید کے احکام میں کوئی حکمت یا مصلحت نہیں ہے یہ شریعت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اسی کتاب میں جس کا ابھی ذکر ہوا، یعنی حجۃ اللہ البالغۃ کے مقدمے میں بہت تفصیل سے یہ بیان کیا ہے کہ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحتیں یا حکمتیں نہیں ہیں۔انہوں نے مثالیں دے کر ایک ایک کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ خیال بالکل بے بنیاد اور غلط ہے، متقدمین کے زمانے سے ہی کچھ حضرات نے قرآن پاک اور شریعت کے احکام میں حکمت اور مصلحت کی تلاش کو اپنی دلچسپی کا خصوصی میدان قرار دیا۔ان اہل علم میں حکیم ترمذی، امام قفال شاشی، امام غزالی کے جلیل القدر استاد امام الحرمین عبدالملک الجوینی اور خود امام غزالی بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان حضرات نے مقاصد شریعت کی تلاش اور تہذیب و تدوین کو اپنے علمی کاموں کا ایک اہم حصہ قرار دیا ہے اور اپنی تحریروں میں مقاصد شریعت کے فلسفہ کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔امام الحرمین نے کتاب البرہان میں، امام غزالی نے کتاب المستصفیٰ میں اور دوسری تحریروں میں مقاصد شریعت پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ان حضرات کے بعد سلطان العلماء علامہ عزالدین بن عبدالسلام السلمی، ان کے شاگرد امام قرافی، ان کے شاگرد امام شاطبی کا کام اس میدان میں بہت نمایاں اور تاریخ ساز ہے۔دوسری طرف علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیم ہیں، ان حضرات نے پورے پورے کتب خانے اس پر تیار کر دیئے کہ شریعت کے احکام کے مقاصد کیا ہیں، حکمتیں اور مصلحتیں کیا ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس علم کو اسرار دین کا نام دیا ہے۔متقدمین نے اس کو مقاصد

شریعت کا نام دیا تھا۔ کسی نے اس کو حکمت کا نام دیا، کسی نے اس کو محاسن شریعت کا نام دیا، نام مختلف رہے ہوں، لیکن مقصد اور مندرجات سب کے ہاں ایک ہی ہیں۔

عبار اتنا شتی و حسنک واحد
وکل إلی ذالک الجمال یشیر

شاہ صاحب نے اس کو دینی علوم کا کُل سرسبد اور اسلامی علوم وفنون کی بنیاد قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سب ائمہ فقہاء میں سے جن کا میں نے نام لیا ہے امام شاطبی اس فن میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں اور علم مقاصد شریعت کو یعنی احکام شریعت میں حکمت اور لم کی تلاش کو انہوں نے ایک انتہائی منظم، مربوط، مدلل اور مرتب علم کی شکل دے دی ہے۔

-☆-